انشائیہ تاریخ کے آئینے میں

سمیرا کنول

صفدر نعیم

Abstract:

The French significant philosopher Montaigne was the pioneer of personal or light Essay in sixteenth century. The Francis Bacon, who was called the father of English essay, initiated this kind of essay in English literature. This kind of essay has been introduced in Urdu literature through English. This article discusses the history and progress of personal or light essay in Urdu literature.

علمی اردو لغت جامع میں لفظ/اصطلاح انشائیہ: (ع۔ امذ) جملے کی ایک قسم جس میں صدق یا کذب کا احتمال نہ ہو۔(ii)۔ ہلکا پھلکا مضمون، غیر سنجیدہ مضمون۔(1)۔ فرہنگ عامرہ میں انشائیہ منسوب بہ انشا۔ (2)۔انگریزی زبان میں انشائیہ کے لیے لائٹ ایسے(Light Essay) کی اصطلاح بھی مستعمل رہی۔ چونکہ اردو میں انشائیہ کی کوئی خاص روایت موجود نہ تھی اِس لیے ادبا اور قارئین کو طنزیہ، مزاحیہ مضامین الگ الگ کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ بعض ادیب تو انشائیہ کو بھی انگریزی زبان کے لفظ (Essay) کا مترادف ہی سمجھتے رہے کیونکہ انگریزی لفظ ''ایسے'' کے معنی کوشش کے ہیں۔ انشائیہ میں بھی ایسی ہی ملی جلی کیفیت ہوتی ہے۔ انشائیہ کے بارے میں یک لخت کوئی واضح لکیر نہیں کھینچی جا سکتی۔ اس کی حدوں کو متعین کرنا اور اس کے خصائص واضح کرنا خاصا مشکل اور الجھا ہوا کام ہے۔ مضمون اور انشائیہ کی بنیادی کڑیاں آپس میں بھی اُلجھی ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے تو اردو میں انشائیہ کی اصطلاح کب اور کیسے رائج ہوئی، کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ دیگر اصنافِ ادب کی طرح انشائیہ کو بھی اردو دان طبقے کی طرف سے شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں:

''لہذا میں چاہتا تھا کہ پرسنل یا لائٹ ایسے کے لیے کوئی نیا اور منفرد اردو نام تجویز کیا جائے۔ انہی دنوں میں نے بھارت کے کسی رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا اور مجھے یہ اتنا اچھا لگا کہ میں نے میرزا ادیب صاحب سے جو اُن دنوں ''ادبِ لطیف'' کے مدیر تھے، اس نام کو پرسنل ایسے کے لیے مختص کرنے کی تجویز پیش کر دی جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے ڈاکٹر سید حسنین انشائیہ کا لفظ لائٹ ایسے کے معنوں میں استعمال کر چکے تھے۔''(3)

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ تقسیم ہندستان سے پہلے ہر قسم کے مضمون کو ''ایسے'' کے معنوں میں استعمال کرنے کی روش عام تھی۔ تقسیم کے بعد انگریزی کے لائٹ ایسے یا پرسنل ایسے کی پیروی میں بہت سی تحریریں وجود میں آئیں جو صنفی اعتبار سے مختلف تھیں۔ لہذا پرسنل یا لائٹ ایسے کے لیے اردو میں لفظ انشائیہ رواج پا گیا۔ ابتداء میں انشائیہ کا لفظ تو مستعمل ہو گیا لیکن عملی طور پر انشائیہ کی مکمل جانکاری حاصل نہ ہو سکی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو میں انشائیہ لکھنے والوں کی لڑی مکمل ہوتی چلی گئی۔ انشائیہ کے تمام پہلوؤں سے مکمل طور پر واقفیت حاصل کرنے کے لیے چند ایک ادبا کی آرا کو شامل کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ انتظار حسین لکھتے ہیں :

''انشائیہ اور عشائیہ یہ دونوں ترکیبیں میرے لیے شروع میں عجب اور اجنبی تھیں۔ عشائیہ کی ترکیب تو اب میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ اس تقریب سے کام بقدرِ لب و دنداں نکلتا ہے۔ انشائیہ میں لذت کا پہلو پیدا ہو تو وہ بھی انشااللہ سمجھ میں آ جائے گا۔ سنا ہے کہ یہ اسی ہمارے زمانے کی کوئی ایجاد ہے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ کام کو دیکھو....اب آپ اِسے ایسے کہیں، انشائے لطیف کہیں، انشائیہ کہیں یہ آپ کی مرضی ہے۔''(4)

بلاشبہ آج سے کم و بیش ستر سال پہلے اُردو انشائیہ کے خدوخال واضح ہونے شروع ہوئے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اردو انشائیہ اس سے قبل اپنا کوئی الگ وجو

د نہیں رکھتا تھا۔اس کا وجود تھا لیکن ذہن میں چھُپے ہوئے خزانے کی طرح۔ بعد ازاں اس کو دریافت کر کے اہل نظر کے سامنے پیش کر دیا گیا اور یہ موضوع بحث بن گیا۔ سہیل احمد لکھتے ہیں :

''نثر پارہ جس میں مختلف پہلوؤں سے کسی خیال یا قائم کردہ رائے یا ذاتی مشاہدے یا تجربے کو ٹٹولا اور پرکھا جائے۔ انشائیہ عموماً مختصر ہوتا ہے۔بطور ادبی صنف اس میں بڑی لچک پائی جاتی ہے اور اسے تراش خراش اور الٹ پلٹ کر تقریباً ہر طرح کے مطالب کے اظہار کے قابل بنانا ممکن ہے۔ شرط یہ کہ یہ اظہار سبک اور براہِ راست ہو، ثقیل یا ادق نہ ہو۔''(5)

انشائیے کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔اپنی ذات کے بارے میں لکھیے یا کائنات کے بارے میں لکھیے۔ کسی ایک نکتے پر بات کریں یا نکتہ در نکتہ نکالتے جائیں۔اپنے جذبوں، خیالوں، تجربوں اور مشاہدوں کو ہلکے پھلکے انداز میں لڑی میں پروتے جائیں۔انشائیہ ترتیب پاتا رہے گا۔ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے :

''انشائیہ نگاری اور تمول کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔اس میں بھی احتیاط لازم ہے کہ دامن تار تار نہ ہو جائے اور چولی مسک نہ جائے۔انشائیہ نگاری کے لیے یا تو بندہ سمندر کنارے جائے یا کم از کم شکر پڑیاں۔ ظاہر ہے جتنا دور جائے گا اتنا ہی زور انشائیہ میں پایا جائے گا۔''(6)

انشائیے کے لیے وسیع مطالعہ، گہرہ مشاہدہ اور تازگی از حد ضروری ہے۔یوں تو تازگی ہر صنفِ ادب کا بنیادی وصف ہوتی ہے تاہم انشائیہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں نہ صرف تازگی کا سب سے زیادہ اظہار ہوتا ہے بلکہ اس کی کمی سے انشائیہ اپنے اعلیٰ مقام سے نیچے آ گرتا ہے۔تازگی سے مراد صرف اظہار وابلاغ کی تازگی نہیں بلکہ اس سے مراد موضوع اور نقطہ نظر کا انوکھا پن بھی ہے جو قاری کو جمود سے نکال کر ماحول کا از سر نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں :

''انشائیہ لکھنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں ایک لحظہ کے لیے رُک کر زندگی کے عام مظاہر کے ایسے تازہ پہلو دکھاتا ہے، جنہیں ہماری نظروں نے اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا اور جو ہمارے لیے گویا موجود نہیں تھے۔۔۔۔اسی طرح ایک انشائیہ لکھنے والا زندگی کے عام مظاہر کے ان تازہ پہلوؤں کو دیکھ لیتا ہے جو زندگی میں سطحی دلچسپی کے باعث ایک عام انسان کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔''(7)

انشائیہ میں جدت اور تازگی انتخاب موضوع تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ انشائیہ کے مطالعہ سے قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ چند لمحوں میں تعجب اور مسرت کی کئی منازل طے کر چکا ہے۔ وزیر آغا لکھتے ہیں :

''انشائیہ نگاری اردو ادب کی تازہ ترین کروٹ ہے اور ''اوراق'' نے اپنی زندگی کے آغاز ہی سے نہ صرف اِس صنفِ ادب میں دلچسپی لی ہے بلکہ اسے ایک تحریک کی صورت میں آگے بڑھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اب تک ہم نے قارئین ''اوراق'' کے سامنے مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیے پیش کیے تھے۔''(8)

انگریزی ادب میں انشائیہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جنھوں نے اپنے انشائیوں کی بدولت انگریزی ادب میں اپنا مقام بنایا۔ چارلس لیمب، ولیم ہیزلٹ، لے ہنٹ، آر۔ ایل سٹیونسن نامور انشائیہ نگار تھے۔ ان کے انشائیوں کے موضوع بھی روزمرہ کے مشاہدوں، تجربوں اور سوچوں پر مبنی تھے۔ یہ وُہ جواہر پارے تھے۔ جن کے ذکر کے بغیر انگریزی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ حامد برگی لکھتے ہیں۔

"اٹھارویں صدی کے انگریزی شعری ادب میں واضح طور پر انشائیہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ کلاسیکی شاعری جس میں جذبہ و تخیل کی بجائے شعور ہئیت اور زبان و بیان کو زیادہ اہمیت دی گئی، شاعری ہوتے ہوئے بھی مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کے زیادہ قریب آگئی۔ الیگزینڈر پوپ نے تو باقاعدہ پابند شاعری میں انسان اور فن تنقید پر منظوم انشائیے تحریر کیے۔''(9)

انشائیہ نگاری کا موجد مونتین (Montaigne) بے حد ذہین تھا۔ اس نے جرمنی اور اٹلی کا سفر بھی کیا۔ اگرچہ اُن کا یہ سفر بیماری کے علاج (گردے کی پتھری) کے لیے تھا لیکن یہاں کے دانشوروں اور اہلِ قلم کے ملاپ سے ان کے ذہنی اُفق کو بہت وسعت ملی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے :

> ''کون نہیں جانتا کہ انشائیہ کی ابتداء مونتین نے کی۔ مونتین غیر افسانوی نثر کو تخلیقی سطح پر لانے کا آرزو مند تھا تاکہ وہ انکشافِ ذات کا ذریعہ بن سکے۔ نیز کاروباری سطح سے اُٹھ کر ادبی سطح پر آجائے۔ اس نے اپنے اِس دلچسپ اور نادر تجربے کے ثمر کو Essay کا نام دیا۔ یہ تحریر کا ایک ایسا نمونہ تھا جس کی مثال پہلے کہیں موجود نہیں تھی۔ اس نئی چیز کو نام بھی نیا تفویض کیا جاتا تاکہ وُہ عملی، سائنسی، مذہبی اور فلسفیانہ مضامین سے الگ نظر آسکتی۔ مونتین نے یہ کام سرانجام دیا۔''(10)

جس طرح کوئی شخص اپنے باغ، گھر یا دوستی سے لطف اندوز ہوتا ہے بالکل اسی طرح ایک مفکر، ادیب، علم وادب کی انتہائی سنجیدہ فضا سے باہر آکر خود کو ذہنی فراغت کی کیفیت میں مبتلا کر کے اپنے ہی فن سے محظوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ مغرب میں انیسویں صدی لفظ ''ایسے'' کے سلسلے میں انتہائی دریادل کا مظاہرہ کر رہی تھی اور یہی وہ زمانہ تھا جب سرسید احمد خاں نے ''ایسے'' کو اردو میں رائج کرنے کی کوشش کی۔ یہ اردو والوں کی خوش قسمتی بھی ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی ان نثری تحریروں کے لیے مضمون کا لفظ ہی استعمال کیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب انشائیہ کا سلسلہ نسب سرسید اور اس کے ہم عصروں سے جوڑنے کی کوشش کی تو لفظ ''ایسے'' ہی استعمال ہونے لگا۔

اردو میں میں مضمون نگاری کی صنف کے بانی سرسید احمد خاں تھے۔ اُن کے سفر انگلستان اختیار کرنے کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ اُن میں سے سرفہرست انگریز قوم کی تہذیب کو بر چشم خود قریب سے دیکھنا اور مطالعہ کرنا تھا۔ اگرچہ انہوں نے یہ سفر بڑی مالی مشکلوں سے کیا۔ یہاں تک کہ انہیں اپنی کتابیں بھی بیچنا پڑیں۔ اکبر الہ آبادی کا یہ شعر اُن کے حسب حال تھا :

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وُہ دیکھیں گھر خدا کا ، ہم خدا کی شان دیکھیں گے

واقعی سر سید احمد خاں نے انگلستان جا کر انگریز قوم کو محنتی اور مودب پایا۔ واپسی پر ہندوستان میں تہذیب الاخلاق جیسے پرچے کا آغاز کر دیا۔اُن کی یہ بڑی کامیابی تھی کہ وہ جب بھی کوئی منصوبہ بناتے تھے اس پر عمل درآمد کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لیتے تھے۔ سر سید کے مضامین انشائیے کے نمونے نہ سہی اردو ادب میں تحرک کا سبب ضرور بنے۔ انہوں نے اِن مضامین سے قوم کی اصلاح اور ترقی کی راہ نکالی۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ سر سید جو انگریزی ایسے کے اتنے گرویدہ ہو گئے تھے تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس پتھر کے ذریعہ وُہ بیک وقت دو پرندے مار سکتے تھے یعنی ایک ہی تحریر سے اصلاح معاشرہ کے ساتھ ساتھ اصلاحِ ادب کا کام بھی لیا جا سکتا تھا۔''(11)

انشائیہ نگار کی حالت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو بڑے خوشگوار موڈ میں بیٹھا ہو اور اپنے کسی بے تکلف دوست سے خوشگوار لہجے میں باتیں کیے جا رہا ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انشائیہ ڈرامائی خود کلامی سے مشابہت رکھتا ہے لیکن انشائیہ لکھنے والا ڈراما نگار کی طرح پابند نہیں ہوتا۔ انشائیہ ذہن کی ترنگ ضرور ہے لیکن کسی مجذوب کی بڑ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے یہی وجہ ہے کہ انشائی نقادوں نے اس کے لیے ہلکا پھلکا انداز اور لطیف لہجہ ناگزیر قرار دیا ہے۔ سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں :

> ''اِسے ایک خاص صنف کا درجہ یوں ملا کہ اس میں وحدت کا وُہ بنیادی اصول موجود تھا جو زمانہ قدیم سے ہر فن پارے کی بنیادی خصوصیات سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کے آگے یہ ہوا کہ لوگوں نے اس ریت کو آگے بڑھایا اور یوں انشائیہ ایک مستقل صنف قرار پائی۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا اسلوب محض یہ ہے کہ اس کی ایک ابتدا اور ایک انتہا

ہو جس سے ایک وحدت پیدا ہو سکے۔ باقی کام لکھنے کی بصیرت کا ہے۔ لہٰذا اس کے اُتنے ہی اسلوب ہوں گے جتنے لکھنے والے۔ ''(12)

انشائیہ کیا ہے؟ کے سوال کو ایک ہی جملے میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کی حدود کو متعین کرنا خاصا کٹھن مرحلہ ہے۔ ایک خوبی جو انشائیہ کو دوسری اصناف سے الگ کرتی ہے، اس کا غیر رسمی طریق کار ہے۔ انشائیہ کے خالق کے پیش نظر ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل سے کام لے اور قاری کے ذہنی میلان کو تحریک دینے کی کوشش کرے۔ وہ تو صرف چند لمحات کے لیے زندگی کی الجھنوں اور مصروفیوں سے الگ کر کے رد عمل کے اظہار کو تسکین فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں:

''انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، چست اور تنگ لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ مو ڑھے پر نیم دراز ہو کر حقہ کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہو جاتا ہے۔ انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اور اس کے تحت انشائیہ کا خالق نہ صرف رسمی طریق کار کی بجائے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرتا ہے۔ بلکہ غیر شخصی موضوعات پر نقد و تبصرے سے کام لینے کی بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے شخصی رد عمل کے کسی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ ''(13)

انشائیے کا بنیادی مقصد قاری یا ناظر کو دلی خوشی فراہم کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس لیے انشائیہ کا خالق طنز سے بہت کم کام لیتا ہے کیونکہ طنزیہ انداز سنجیدہ مقاصد اور سنجیدہ موضوعات شروع کر دیتا ہے۔ مزاح کا عنصر انشائیہ میں وسعت اور زیر لب مسکراہٹ لاتا ہے۔ ایک کامیاب انشائیہ، قاری کو زندگی کے کسی پہلو کے نئے زاویے سے روشناس کراتا ہے اور قاری انشائیے کے اختتام پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے اس مو ضوع پر ایک مخفی گوشے کا نیا پہلو دیکھا ہے۔ رشید امجد نے انشائیے کے بارے میں لکھا ہے:

''انشائیہ اظہار ذات کی ایک صورت ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر انکشاف ذات کا ایک ایسا عمل ہے، جس میں روحانیت کا ذائقہ بھی ہے اور مادیت کی مٹھاس بھی۔ انشائیہ نگار کسی خارجی یا داخلی حوالے سے ذات کے سمندر میں غواصی کی مسرت میں اسے بھی شامل کر لیتا ہے۔ اس لحاظ سے انشائیہ اپنی مسرتوں میں دوسروں کو شریک کرنے کا عمل ہے اور یہ روحانی عمل بن جاتا ہے۔''(14)

اردو انشائیہ نے انتہائی کم عرصہ میں اپنا چہرہ مہرہ واضح کر کے بطور صنف اپنی پہچان بنائی ہے اور اب یہ ایک رجحان بن چکا ہے۔ اس رجحان کو پروان چڑھانے میں ان تخلیق کاروں کا بہت بڑا حصہ ہے جنہوں نے اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ اس کی اشاعت و ترویج میں خصوصی دل چسپی لی اور اس کو ایک کامیاب صنف کا مقام دلوایا۔ اب اس صنف ادب میں انسانی زندگی کے سارے پہلو ہی سمٹ آئے ہیں۔

جہاں تک اردو انشائیہ کی کوئی حتمی تعریف وضع کرنے کا تعلق ہے یہ صرف انشائیہ ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ ادب کی ہر ایک صنف کا مسئلہ ہے۔ مختلف تعریفیں اور تضادات موجود ہونے کے باوجود تمام اصناف کو سمجھنے میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا۔ انشائیہ کی تعریف اور تفہیم کے معاملے میں بھی کچھ ایسے ہی معاملات زیر بحث آتے رہے۔ حیدر قریشی لکھتے ہیں :

''وزیر آغا پہلے انشائیہ نگار بھی ہیں اور کمالِ فن کے لحاظ سے آخری بھی، لیکن انہوں نے اس صنف کے ارتقا میں اپنی ذمہ داریوں سے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ خود انشائیے لکھ رہے ہیں۔ انشائیے کی تفہیم کے لیے مضامین لکھ چکے ہیں اور نوجوان انشائیہ نگاروں کو متعارف کرا رہے ہیں۔ یوں محض تین دہائیاں پہلے مولانا صلاح الدین احمد کی یہ تمنا اور دُعا اب ایک حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔''(15)

انشائیہ ذہن کی ایک آزاد ترنگ ہے جس پر کوئی جبری پابندی نہیں لگائی جا سکتی ہے۔ انشائیہ شعور کی رو ہے جو ماضی کے واقعات، حال کے تجربات اور مستقبل کے خوابوں کو آپس میں ملا کر یوں پیش کرتی

ہے جیسے واقعات، تجربات اور خوابوں کو نئی تعبیر مل رہی ہو۔ مزاحیہ طرزِ اظہار کا استعمال انشائیے میں ایک بڑی حد تک انشائیہ نگار کے خاص موڈ پر مبنی ہوتا ہے۔ سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں :

> ''وہ حضرات جو صنف انشائیہ کی مقبولیت اور اثر پذیری کو انشائیہ پڑھنے اور لکھنے والوں کے گراف کی کمی بیشی سے جانچنے کی سعی فرماتے ہیں، میرے خیال میں درست نہیں کرتے کیونکہ انشائیہ جس قسم کا مزاج رکھتا ہے اس کو سمجھنے اور اس سے لطف کشید کرنے کے لیے ذاتی تربیت اور ریاضت کی اشد ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ اردو ادب میں انفرادی سوچ جس خون کی کمی کا شکار تھی انشائیے نے اس کی حتی المقدور پورا کر نے کی کوشش کی ہے اور میں اِسے انشائیے کی ایک اہم دین متصور کرتا ہوں۔''(16)

انشائیہ مستقبل کی بڑی تخلیقی صنف ہے کیونکہ اب خیال افروزی کا آغاز ہو چکا ہے۔ انشائیہ نگاروں کی ایک کھیپ تیار ہو چکی ہے۔ کامیاب انشائیے لکھے جا رہے ہیں۔ بہت سے انشائی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور بہت سے آ رہے ہیں بلکہ اب تو انشائی تنقید کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ انشائیہ اور اس کی مختلف جہات پر ایم۔اے، ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کے مقالاجات لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں۔

انشائیے کے لیے لازم ہے کہ اس کو یکسانیت سے دُور رکھا جائے اور اس کے اسلوب میں ایسے اجزاء کو شامل کیا جائے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیں۔ ایسے اجزاہر انشائیہ نگار اپنی افتادِ طبع کے مطابق شامل کر سکتا ہے اور یوں اس کے حسن میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔

ایک عرصہ تک سر سید احمد خاں، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری اور شوکت تھانوی وغیرہ کو بھی انشائیہ نگاروں کی فہرست میں سمجھا جاتا رہا۔ اختلافی مضامین بھی چھپتے رہے اور بیان بازی بھی ہوتی رہی۔ آہستہ آہستہ گرد ہٹتی رہی اور حقیقت سامنے آ گئی۔ بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں انشائیہ تنقیدی مباحث سے نکل کر انشائیہ نگاروں کے ہاتھ میں آ گیا۔ انشائیہ کی تفہیم اور وضاحت کے حوالے سے بہت سے مضامین منظر عام پر چکے تھے۔ انشائیہ کے خدوخال واضح ہو گئے اور کسی قسم کا کوئی مغالطہ باقی نہیں رہا تھا۔

ارتقائی دور میں بہت سے مباحث نے جنم لیا۔ موجودہ دور میں انشائیہ کو باقاعدہ صنفِ ادب کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے 1991 میں ''جدید اردو انشائیہ'' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کروائی جو اسی سال دیگر کتابوں کے ساتھ شائع بھی ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی نے انشائیہ کے موضوع پر ڈاکٹر بشیر سیفی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری جاری کر کے یہ ثابت کر دیا کہ دیگر اصناف ادب کی طرح انشائیہ بھی ایک اہم صنف ادب ہے۔ بھارت میں ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری پر پی ایچ۔ڈی کے مقالات لکھے جا رہے ہیں۔ اکبر حمیدی لکھتے ہیں :

> ''انشائیہ کی ان فتوحات میں بلاشبہ سب سے فعال کردار ڈاکٹر وزیر آغا کا ہے جنہوں نے اپنے مشہور رسالے ''اوراق'' کے ذریعے انشائیہ نگاری کو ایک تحریک بنا دیا۔ ڈاکٹر سلیم آغا نے نہ صرف تواتر کے ہاتھ انشائیے لکھے بلکہ انشائیوں کے انتخابات بھی شائع کیے۔ تاہم انشائیہ فہمی کی تحریک میں جہاں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر بشیر سیفی، پروفیسر مشکور حسین یاد، پروفیسر نظر صدیقی نے تنقیدی میدان میں کام کیا وہاں انشائیہ نگاروں نے مسلسل اعلیٰ پائے کے انشائیے لکھے اور اس نئی صنف کو نئے خیالات اور نئے نئے اسالیب سے مالا مال کر دیا۔ ''(17)

اردو انشائیے کی تاریخ بتاتی ہے کہ جدید اردو انشائیہ 1960 کے بعد واضح حیثیت اور خدوخال کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ اس دور میں سر سید احمد خاں، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری اور شوکت تھانوی کے مضامین کو جدید اردو انشائیے سے الگ سمجھا جائے لگا تھا۔ 1960 کے بعد متواتر، واضح اور نمایاں انشائیہ لکھنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، جمیل آذر، انور سدید، مشتاق قمر، نظر صدیقی، کامل القادری، بشیر سیفی، حامد برگی، محمد اسداللہ اور سلیم آغا قزلباش کے نام سر فہرست ہیں۔ اسی فہرست کے ذیل میں میں جوگندر پال، شہزاد احمد، حیدر قریشی، انجم نیازی اور جان کاشمیری کے نام بھی شامل کیے جا سکتے ہیں کیونکہ انشائیہ نگاری میں ان کا بھی ایک خاص حصّہ ہے۔

1980 کے بعد کے انشائیہ نگاروں کی فہرست یوں مرتب کی جاسکتی ہے۔اس فہرست میں اکبر حمیدی، ناصر عباس نیر، اظہر ادیب، محمد اقبال انجم، مشتاق احمد، رشید احمد گوریجہ، حنیف باوا، خیرالدین انصاری، منور عثمانی، محمد ہمایوں، خالد صدیقی، امجد طفیل، جاوید اصغر، مختار پارس سریتا خاں اور خالد سہیل ملک کے نام شامل ہیں جنہوں نے انشائیے کی اس تحریک کو بڑی کامیابی سے آگے بڑھایا اور انشائیے لکھ کر اپنا حصہ ڈالا اور کچھ ڈال بھی رہے ہیں۔

اردو انشائیے میں سیاسی، تاریخی، نظریاتی اور فلسفیاتی موضوعات کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔اکبر حمیدی نے ایک گھمبیر اور دکھ بھرے المیہ انداز میں ایک انشائیہ لکھا، جس کا عنوان تھا''میں سوچتا ہوں''۔یہ انشائیہ اسی کی دہائی میں اوراق میں شائع بھی ہوا۔اسی طرح پھر (1985)تاریخی انشائیہ نظام سقہ''،سیاسی انشائیہ ''ٹھینکا باجے'' اور پھر نظریاتی حوالے سے ''سپنوں کا گاؤں اور بگڑا ہوا بچہ، جیسے معروف انشائیے منظر عام پر آئے۔

اردو انشائیہ انیسویں صدی کے دوسرے نصف کے آغاز کا قصہ ہے اور اب یہ کوئی دو چار برس کی بات نہیں رہی۔انشائیہ تخلیقی سطح کی چیز ہے تو ضروری ہے کہ اس کا اسلوب بھی تخلیقی سطح کے محاسن کا عکاس ہو۔عام طور پر انشائیہ کی بحث میں اس نکتے کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔اردو ادب میں انشائیے کی عمر تقریباً ستر سال ہو چکی ہے اور پختگی کی منازل باآسانی طے کر چکا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''انشائیہ وہ واحد صنفِ ادب ہے جو انسان کو اس کی عادات و معمولات کے حصار سے باہر نکال کر اور اس کی غنودگی کو کافور کر کے اسے متجسس نظروں سے چاروں طرف دیکھنے پر اکساتی ہے اور چاہتی ہے کہ انسان زندگی کی کنہ میں اتر کر یا اس سے اوپر اُٹھ کر دیکھے کہ چاروں طرف کتنے نئے پرت ہر وقت نظروں کے سامنے آرہے ہیں۔انشا ئیہ، نظریات کے سامنے آرہے ہیں۔انشائیہ، نظریات اور معتقدات ہی نہیں چھوٹی چھوٹی اشیاء، اور عادات.....بلکہ اُن میں چھپے اس اسرار کو جاننے کا طالب ہے جس کا کوئی انت نہیں ہے۔''(18)

تخلیقی صلاحیتوں ہی کی بدولت انسان نے کائنات کے پُراسرار رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے اور اب انسان تخیل کی منازل بھی طے کر چکا ہے۔ انشائیہ نگار کا میدان اور طریقہ کار بھی آج کے عالم گیر رویے سے منسلک ہے جس کی مدد سے کائنات کی پُراسراریت کے اندر سفر کرنا ممکن ہوا ہے۔ وزیر آغا نے تو واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ انشائیہ آنے والے دور میں اردو ادب کی واحد صنف ہو گی جس کے ذریعے انسان آگہی کی سطح پر، مخفی صلاحیتوں اور کائنات کی جادوانہ جہتوں سے متعارف ہو سکے گا۔ اردو انشائیہ کی تحریک نے بہت سے انشائیہ نگار پیدا کیے۔ اُن انشائیہ نگاروں کی بدولت اردو ادب میں نئے موضوعات اور نئے اسلوب کے ساتھ تخلیقی کاوشیں سامنے آئیں۔ اس انشائی روایت اور تحریک کے ساتھ انشائی تنقید کا پیدا ہو جانا بھی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ تاہم اکیسویں صدی میں انشائی تنقید کا بھی آغاز ہو گیا۔ پروفیسر جمیل آذر نے انشائی تنقید پر مضامین لکھنا شروع کر دیے۔ اُن کا پہلا مضمون ''انشائی تنقیدی رویہ'' سمبل کے شمارہ جنوری تا جون 2007 میں شائع ہوا۔ اُن کا دوسرا مضمون ''انشائی تنقید'' جھیل اور نارسی سس'' کے عنوان سے الحمرا کے جنوری 2008 کے شمارے میں شائع ہوا۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ اُن کے ان مضامین پر مثبت رویہ سامنے آیا۔ چنانچہ انشائی تنقید کے حوالے سے جمیل آذر لکھتے ہیں:

> ''انشائی تنقید کا اصطلاحی معنی ہے انفرادی تخلیق۔ اس تنقیدی رویہ کا اہم پہلو یہ ہے کہ نقاد تخلیق کار اور اس کی تخلیق کے ساتھ وابستگی (attachment) محبت، اور مودت کا رشتہ قائم رکھتا ہے جب کہ غیر انشائی تنقید میں نقاد اس سلسلے میں غیر وابستہ (Detached) ہوتا ہے۔ انشائی تنقید فکر اساس (Contemplation based) ہوتی ہے۔ انشائی نقاد فن پارے پر جتنا غور و فکر کرتا ہے حسنِ معنی اتنا ہی اس پر آشکارا ہو جاتا ہے..... نقاد پوری شمولیت (Involvement) کے ساتھ پُراسرار فکری انبساط سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔''(19)

اقتباس سے واضح ہے کہ انشائی تنقید تخلیقی حسن و توانائی کی حامل ہوتی ہے۔ بہت سے قاری نقاد کی چند سطریں پڑھ کر ہی اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ مزید پڑھنے کی دلچسپی کھو دیتے ہیں۔ پڑھنا از حد

ضروری ہوتا ہے کیونکہ پس منظر اور تمہید کو جانے بغیر کسی بھی فن پر مناسب طور پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔ مکمل تفہیم اور اپنے مطالعے اور علمی بصیرت کو شامل کرنے کے بعد جو تحریر سامنے آئے گی یقیناً وہ ایک تخلیق سے کم نہیں ہو گی اور یہ تنقید انشائی کہلانے کی مستحق ہو گی۔ جمیل آذر لکھتے ہیں:

''ایسے ژولیدہ فکر تنقیدی مضامین پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کے ہاں تخلیقی جوہر کا فقدان ہے۔ تنقید جب تخلیقی سطح پر نہیں پہنچتی وہ قاری کو نہ تو فکری نشاط سے ہمکنار کر سکتی ہے اور نہ تنقید کے اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتی ہے، لہذا میں نے انشائی تنقیدی رویہ کے تصور پر چند مضامین سپردِ قلم کیے جو ششماہی رسالہ سمبل اور ماہنامہ الحمرا میں شائع ہوئے۔''(20)

انشائی تنقید کے حوالے سے مزید گفتگو کرتے ہوئے جمیل آذر لکھتے ہیں:

''انشائی تنقید پر اظہار خیال کرنے سے پہلے یہ بات قابل ذکر ہے کہ وُہ کون سے محرکات ہیں جنہوں نے مجھے اس تنقیدی رویے کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا۔ گزشتہ دنوں میں جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات اور ساخت شکن تنقید جیسے موضوعات پر بڑے تواتر کے ساتھ ادبی جرائد میں مضامین شائع ہوئے۔ اس تنقیدی ڈسکورس میں مجھے بھی شرکت کا شرف حاصل ہوا۔''(21)

انشائی تنقید میں نقاد فن پارے کا مطالعہ خلوص دل اور خلوص نیت سے کرتا ہے۔ وُہ ارتکازِ ذہن کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی بیدار کرتا ہے۔ اس فن پارے کو بہ غور اور خلوصِ دل کے ساتھ پڑھنے سے جو لطف اور ترفع کی سطح اُسے خود خود محسوس ہوئی تھی وہ دوسروں کو بھی اس میں شامل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ دوسروں کو اپنے پر کیف تجربے میں شامل کرنے کی کوشش ہی انشائی تنقید ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ یہ عمل خاصا مشکل لیکن دلچسپ بن جاتا ہے اور انشائی تخلیق رفعت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' بھی انشائی تنقید کی فہرست میں شامل کی جا سکتی ہے۔ جس میں اردو شاعری پر تنقید کے حوالے سے جو تنقیدی پس منظر پیش کیا گیا ہے، وہ انشائی تنقید

سے کم نہیں ہے۔انشائیہ کو بطور صنفِ ادب اپنی جگہ بنا چکا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ انشائی تنقید کی روایت کس حد تک اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

وزیر آغا اردو ادب کے وہ واحد ادیب ہیں جن کا نام اردو انشائیے کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ اس کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔اب اس صنف کا ذکر اور تاریخ ان کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔مشتاق احمد یوسفی نے تو ان کو اردو ادب کا موجد اور خاتم بھی قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''تقریر ہو یا تحریر، تنقید ہو یا تقریظ، نظم ہو یا انشائیہ، ڈاکٹر وزیر آغا ہر رنگ میں اپنے انداز قد سے پہچانے جاتے ہیں....روز مرہ کے واقعات اور تاثرات کو بھی وہ جس زاویے سے دیکھتے ہیں، وہ انہی کی روشِ خاص ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ اردو میں وہ اس صنفِ ادب (''ایسے'') کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی ہیں تو بے جا نہ ہو گا، اس لیے کہ اس دور میں جب پڑھنے والوں کو سیروں کے حساب سے بکنے والے ناولوں کا چسکا پڑ گیا ہے، اتنے مختصر مضامین پڑھنے کی فرصت کس کو ملتی ہے۔''(22)

اقتباس سے واضح ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کا طرزِ تحریر اور اسلوب بہت منفرد اور نمایاں ہے۔ان کی تحریر اور تقریر اپنے شگفتہ انداز سے پہچانی جاتی ہے۔اُن کی انشائیہ نگار اور بو قلمونی کے حوالے سے انور سدید کا کہنا ہے:

> ''اردو کے انشائیہ نگاروں میں وزیر آغا کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے زیادہ شگفتہ انشائیے لکھے ہیں، ان کے موضوعات میں تنوع اور بو قلمونی ہے۔انہوں نے انشائیہ نگاروں کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا ہے اور ان کا حلقہ اثر وسیع ہے۔''(23)

اردو انشائیہ کی تاریخ اور ارتقا کو سمیٹے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ لفظ انشائیہ، انشا سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی تخلیق کے ہیں۔ارود ادب میں انشائیہ کی اصطلاح بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں مستعمل ہوئی۔ابتدائی دور میں انشائیے کے لیے ایسے، پرسنل ایسے، لائٹ ایسے، انشائیے لطیف، لطیف پارہ اور

مضمون لطیف کے الفاظ اور اصطلاحات بھی استعمال ہوتی رہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے ادبی جریدے ''اوراق'' کے ذریعے اس اصطلاح کے لیے انشائیہ کا لفظ عام کر دیا اور انشائیہ کو باقاعدہ ایک تحریک بنا دیا۔انہوں نے نہ صرف خود انشائیے لکھے اور شائع کیے بلکہ انشائیہ نگاروں کی ایک کھیپ بھی تیار کی۔انشائیہ کی تفہیم اور ترویج کے لیے مضامین لکھے۔انشائیہ کی ترویج واشاعت کے لیے مختلف حوالوں سے علمی وادبی مباحث کا آغاز بھی کیا۔اس طویل جدوجہد کے بعد انشائیہ اردو ادب کی ایک باقاعدہ صنف بن چکا ہے اور اس کے وجود اور تفہیم کے حوالے سے کوئی مغالطہ باقی نہیں ہے۔انشائیہ نگاروں کے ہاں تخلیقی پختگی آچکی ہے۔اب نہ صرف انشائیہ نگاری کامیابی کے ساتھ جاری وساری ہے بلکہ انشائی تنقید پر بھی کام ہو رہا ہے۔

حواشی:

1۔ وارث سرہندی(مرتبہ)، علمی اردو ادب جامع،(لاہور علمی کتب خانہ،2000)،ص141

2۔ خویشگی، محمد عبداللہ خاں(مرتبہ)، فرہنگ عامرہ طبع دوم، (اسلام آباد مقتدورہ قومی زبان،2007)، ص67

3۔ وزیر آغا، ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،(لاہور مکتبہ فکر وخیال،1990)،ص80

4۔ انتظار حسین، مشمولہ:انشائیہ کی بنیاد: ڈاکٹر سلیم اختر،(لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، 2002)،ص371

5۔ سہیل احمد خاں، ڈاکٹر سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، (لاہور،شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی،2005)،ص76

6۔ سلیم اختر، ڈاکٹر،انشائیہ کی بنیاد،(لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،2002)،ص294

7۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،ص13،12

8۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،اداریہ:اوراق،شمارہ خاص نمبر2، 1967،مرتبہ ،اقبال آفاقی،2000، ص66

9۔ حامد برگی، مضمون: انشائیہ کا فن بشمولہ جدید اردو انشائیہ، مرتبہ اکبر حمیدی، (اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، 1991)، ص 88

10۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ کے خدوخال، ص 23

11۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2002)، ص 65

12۔ سجاد باقر رضوی، بہ حوالہ: انشائیہ کی بنیاد، (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2002)، ص 372

13۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ کے خدوخال، ص 10

14۔ رشید امجد، مضمون: مشمولہ: جدید اردو انشائیہ، مرتبہ اکبر حمیدی، (اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، 1991)، ص 49

15۔ حیدر قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، عہد ساز شخصیت، (لاہور نایاب پبلی کیشنز، 1995)، ص 133

16۔ سلیم آغا قزلباش، مضمون: انشائیہ کیا ہے۔ مطبوعہ: ماہانہ اوراق جولائی، اگست 1999، ص 182

17۔ اکبر حمیدی، مضمون: اردو انشائیہ اور نئے افق، مطبوعہ: ماہانہ اوراق جولائی، اگست 1999، ص 176

18۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ کے خدوخال، ص 77

19۔ جمیل آذر، پروفیسر، انشائی تنقید، (لاہور، مقبول اکیڈمی، 2009)، ص 140

20۔ ایضاً، ص 8

21۔ ایضاً، ص 15

22۔ مشتاق احمد یوسفی، پیش لفظ۔ چوری سے یاری تک از وزیر آغا، (لاہور، جدید ناشرین، س۔ن)، ص 9،10

23۔ انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا۔ ایک مطالعہ، (کراچی، مکتبہ اسلوب، 1983)، ص 84,85

ماخذ:

1۔ وارث سرہندی، مرتبہ علمی اردو ادب جامع، لاہور علمی کتب خانہ، 2000

2۔ محمد عبداللہ خاں خویشگی، مرتبہ فرہنگ عامرہ طبع دوم، اسلام آباد مقتدورہ قومی زبان، 2007

3۔ ڈاکٹر وزیر آغا، انشائیہ کے خد و خال، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، 1990

4۔ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2002

5۔ سہیل احمد خاں، ڈاکٹر سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، لاہور، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، 2005

6۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اداریہ: اوراق، شمارہ خاص نمبر 2، 1967، مرتبہ، اقبال آفاقی، 2000

7۔ اکبر حمیدی، مضمون: اردو انشائیہ اور نئے افق، مطبوعہ: ماہانہ اوراق جولائی، اگست 1999

8۔ حیدر قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، عہد ساز شخصیت، لاہور نایاب پبلی کیشنز، 1995

9۔ پروفیسر جمیل آذر، انشائی تنقید، لاہور، مقبول اکیڈمی، 2009

10۔ وزیر آغا، چوری سے یاری تک، لاہور، جدید ناشرین، س۔ن

11۔ انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا۔ ایک مطالعہ، کراچی، مکتبہ اسلوب، 1983